P. O. RGD. No. A922

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۱ | ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء | ایڈیٹر۔ قاضی عبدالغفار | ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۲ ہجری | نمبر ۲۰

کچھ اپنی باتیں

علاقائی زبان کی تحریک

معاصر قومی آواز نے جسکے لایق اڈیٹر اس عارضی کمیٹی کے کنوینر ہیں جو انجمن ترقی اردو نے قائم کی ہے اس تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حقیقت یہہ ہے کہ اتر پردیش کے شہر شہر قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں اردو مہم کے مرکز قائم کرنا اور ہر ہر جگہ سے بالغوں کے دستخط یا انگولیوں کے نشان حاصل کرنا۔ یہہ کام اتنا آسان تہا ہی نہیں جیسا سمجہا گیا تہا کیونکہ یہہ تعمیری اور تنظیمی مہم ہے جسکی کامیابی کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔"

اسکے بعد قومی آواز نے ان دشواریوں کا تفصیل کے ساتہہ ذکر کیا ہے جو گذشتہ تقریباً ۸ ماہ میں پیش آئیں۔ ہمارے لئے یہہ رکاوٹیں اور دشواریاں ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مرکزی انجمن کے پیش نظر وہ سب رکاوٹیں اور دشواریاں اسی وقت تہیں جب اس نے اس تحریک کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا تہا۔

یہہ سمجھنا ہی صحیح نہیں کہ ان رکاوٹوں اور دشواریوں کی وجہ سے کام رک گیا یا اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہئے تہی۔ واقعہ یہہ ہے کہ تقریباً ۸ ماہ کی جد وجہد میں ایک تنظیم کا پیدا کرلینا اور ۱۰ لاکہہ دستخطوں کا حاصل کرلینا کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ عارضی کمیٹی اور اسکے کارکنوں کے لئے قابل مبارکباد ہے۔ جو لوگ صرف گہر بیٹہہ کر اعتراض کرنا جانتے ہیں یا جو کسی خاص مقصد اور غرض کے تحت اعتراض کیا کرتے ہیں وہ تو ہر حال میں نکتہ چینی کرتے ہی رہینگے۔ انکی نکتہ چینی ہماری راہ میں حایل نہیں ہوسکتی۔

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تک اس تحریک کی جو تنظیم بن گئی ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ جس طرح سات آٹھہ ماہ میں ۱۰ لاکہہ دستخط حاصل ہوئے اسی طرح آیندہ

تین ماہ میں بقیہ ۱۰ لاکھ بھی حاصل ہوجائینگے اس لئے کہ اب تنظیمی مشین تقریباً مکمل ہوگئی ہے اور زیادہ تیزی سے کام کررہی ہے۔ اب دستخطوں کی آخری تاریخ ۲۴ دسمبر مقرر کی گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے کارکن اس تاریخ تک اپنی منزل پر نہ پہنچ جائیں۔

صرف دو ہی باتیں ایسی ہیں جن پر ہم بار بار زور دیتے رہے ہیں۔ ایک تو یہہ کہ ہمارے کارکن مشکلات کے مقابلہ میں ہمت نہ ہاریں۔ یہہ اپنی قسم کی پہلی دستوری تحریک ہے جو اتنے بڑے پیمانہ پر اور اتنے بڑے صوبہ میں اور اتنے مخالفوں کے مقابلہ میں شروع کی گئی ہے۔ کام کرنے والوں کی ہمت ہی اس تحریک کی کامیابی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔

اس تحریک کا دوسرا پہلو جو اردو زبان کے حامیوں کی فوری توجہ کا مستحق ہے اس کا مالی پہلو ہے۔ مرکزی انجمن اس وقت تک اس کام کی تنظیم پر کافی رقم خرچ کر چکی ہے اور اس کام کے لئے وہ اپنی مالی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرتی ہے۔ لیکن اردو کے دوسرے حامیوں کو بھی اس وسیع تحریک کے ساتھہ اپنی عملی ہمدردی کا کچھہ ثبوت دینا چاہئے۔ ہمارے کارکن تو اپنا وقت اور اپنی صلاحتیں اس تحریک کو دے رہے ہیں لیکن جو لوگ عملی میدان میں نہیں آسکے ہیں ان کا تو یقیناً یہہ فرض ہے کہ کم از کم مالی امداد کی صورت میں اس تحریک سے اپنی ہمدردی اور تائید کا ثبوت دیں۔ یہی دو تین مہینہ ایسے ہیں جب اس تحریک کے مرکز پر قدمے، سخنے، درمے ہر طرح اردو کے حامیوں کو مجتمع ہو جانا ہے اور ہر شخص کو اپنے اپنے حصے کا بوجھہ اٹھانا ہے۔ ہم محض زبانی تعریفیں اور زبانی تائید سے متاثر نہیں ہوتے۔ آزمائش میں اردو کی موت و زیست کے کشمکش میں یہہ آخری داؤں ہے۔ عام مالی تائید کے بغیر بھی ہمیں یقین ہے کہ ہماری تحریک ہار نہیں سکتی اور انشاءاللہ بہت جلد کامیاب ہوگی، لیکن ان کارکنوں کی جو دن رات اپنی ساری طاقت اس اس کام پر صرف کررہے ہیں عوام کی مالی امداد سے (خواہ وہ کتنی ہی کم ہو) ہمت بندھتی ہے اور انہیں تقویت حاصل ہوتی اور انہیں باور ا یقین ہوجاتا ہے کہ رائے عامہ ان کے پاس پشت ہے۔ کارکنوں کی یہہ ہمت افزائی ضروری ہے اور صرف اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ عوام خواہ اس کام کے لئے دو ہی پیسے دیں لیکن دیں ضرور تاکہ وہ کارکنوں کے نظر میں ان کی عملی ہمدردی کی سند ہوں۔ اردو زبان کے لاکھوں حامی ایسے بھی ہونگے جن تک ہم شاید دستخط لینے کے لئے پہنچ بھی نہ سکیں، اس لئے کہ انتہائی تعداد ہم نے صرف ۲۰ لاکھ رکھی ہے لیکن دستخطوں کے بجائے ہم ان کی عملی ہمدردی کا ثبوت اس صورت میں چاہتے ہیں کہ وہ تھوڑا بہت اس تحریک کے اخراجات کی مالی کفالت کرلیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے دل ہمارے ساتھہ ہیں، لیکن اس ہمدردی کا کچھہ مظاہرہ بھی ہونا چاہئے تاکہ یہہ تحریک زیادہ سے زیادہ عوامی رنگ اختیار کرے۔

ہمارے دوستوں کو تحریک کے اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے۔

ہلکے ہلکے اشارے

حیدرآباد میں زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ جہاں تک زبان کے مسئلہ کا تعلق ہے ہماری یہہ پالیسی ہے کہ مقامی زبانوں کو ترقی کے مواقع دئیے جائیں اور کسی بھی مقامی زبان کو دبایا نہ جائے لیکن جامعات میں فی الوقت ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہی کو رکھا جائے گا کیونکہ اگر انگریزی کو نکال دیا گیا تو ہندی یا کسی اور مقامی زبان میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ اس کی جگہ لے سکے۔ ہم انگریزی کو ہٹانے میں تیزی کرکے تعلیم کے معیار کو گرانا نہیں چاہتے اور نہ بین الاقوامی معلومات میں پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔

پنڈت جی نے یہہ بھی فرمایا کہ:

جامعات میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی کے بجائے ہندستانی بتدریج جگہہ لیگی۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اسکے لئے کتنا عرصہ لگیگا۔ اسکا انحصار تو حالات پر ہوگا۔

—— یہہ تقریر اتنی محتاط اور معتدل ہے کہ ہمیں تعجب ہوگا اگر ٹنڈن جی وزیر اعظم کی ایسی باتوں پر خفا نہ ہوں! عجیب بات یہہ ہے (ممکن ہے کہ رپورٹر کی غلطی ہو) کہ پنڈت جی نے انگریزی کی جگہہ لینے والی جس زبان کا ذکر کیا اسے "ہندستانی" کہا۔ اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض یہہ بات ہے کہ انہوں نے یہہ فرمادیا کہ ہندی میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ انگریزی کی جگہہ لے سکے! اور اس سے بھی بدتر انکا یہہ اعلان تھا کہ گورنمنٹ کی پالیسی یہہ ہے کہ مقامی زبانوں کو ترقی کے مواقع دیئے جائیں اور کسی بھی مقامی زبان کو دبایا نہ جائے۔

—— حیدرآباد کے آنریبل پر جو اردو زبان کے وجود ہی سے انکار فرماتے ہیں اور اترپردیش کے نیتاؤں پر پنڈت نہرو کی یہہ بات گراں گذرے تو تعجب نہیں!

—— اس تقریر پر ہم ان صاحبان کے احتجاجی بیان کا انتظار کر رہے ہیں۔

—— بنارس میں ہندی جن پد ساہتیہ سمیلن کا افتتاح کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر ٹنڈن جی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ "اترپردیش میں جو ہندی کا علاقہ ہے یہہ کوشش کی جارہی ہے کہ اردو کو وہی مرتبہ حاصل ہوجائے جو ہندی کو ہے۔"

—— سمجھہ میں یہہ بات نہیں آتی کہ اس ذرا سی بات پر ہمارے نیتا اپنے رنج و افسوس کو اسقدر کیوں شائع کر رہے ہیں۔ ایک بہت ہی کھلی ہوئی اور آسان بات ہے کہ اگر اردو کے حامیوں نے ثابت کردیا کہ انکی زبان علاقائی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور انکے اس معروضہ کو صدر جمہوریہ نے بھی قبول فرمالیا تب ہی تو اردو کو علاقائی حیثیت حاصل ہوگی۔ ورنہ یہہ جد وجہد خود ہی پھس پھسا کر رہ جائیگی! کیا ضروری ہے کہ ٹنڈن جی اور انکے ہم خیال احباب ابھی سے گھبرا گھبرا کر ہر ہفتہ میں دو دفعہ بیانات دیتے پھریں۔ یہہ تو "قبل از مرگ واویلا" کا سا معاملہ ہو گیا۔ یا یوں کہئیے کہ سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا! ذرا تو دم لیجئیے۔ اردو کے حامیوں کو تو ابھی اپنا دعوے ثابت کرنا ہے، پھر صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے، تب ہی تو معلوم ہوگا اس دعوے کی دلیل مضبوط ہے یا نہیں۔ ابھی صرف اتنی ہی بات پر اظہار افسوس کا کیا موقعہ ہے کہ اردو کے حامی اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی ایک قانونی اور دستوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہہ دعوے نہ ثابت ہوا تو وہ خود شرما کر رہ جائینگے۔ ٹنڈن جی کو ابھی سے ہندی کے لئے کوئی خطرہ کیسے نظر آنے لگا!

—— اس جمہوری ہندستان میں یہہ تو ایک عجیب بات ہے کہ نیتاؤں کی مرضی کے خلاف اگر کوئی آئینی جد وجہد بھی شروع ہو تو وہ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو — صرف اس لئے کہ انہیں یہہ بات پسند نہیں!! اب ہم اپنے معزز نیتاؤں کی پسند اور مرضی کو دیکھیں یا بھارت کے دستور اساسی کو دیکھیں! ٹنڈن جی اس وقت کہاں تھے جب دفعہ ۳۴۷ دستور میں شامل کی گئی تھی! اور اب بھی تو موصوف پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ کیوں یہہ تحریک پیش نہیں فرماتے کہ دفعہ ۳۴۷ کم بخت بھارت کے دستور سے خارج کردی جائے!

"دوائے وقت"، کراچی کا ایک مزاحیہ

کراچی میں تقریباً پندرہ ہزار شاعر ہیں جن میں کوئی پانچ ہزار بزرگ "سکہ بند شاعر" سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہہ ہے کہ اس مال کی کھپت نہیں ہوسکتی، نہ ان سب لوگوں کا کلام اخباروں اور رسالوں میں چھپ سکتا ہے، نہ اتنے بڑے مشاعرے کا انتظام ہوسکتا ہے جس میں زیادہ نہ سہی کم از کم پانچ ہزار شاعر اپنا کلام سنا سکیں اور

مشاعرے کا انتظام بھی ہو جائے تو "سامعین" کہاں سے آئیں گے کیونکہ جس طرح لاہور میں "حاضرین" مفقود ہیں اسی طرح کراچی میں "سامعین" کیاب ہیں اور یہہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شاعری کی ترقی کا انحصار داد پر ہے، داد سے نہال سخن کی آبیاری نہ کی جائے تو چمنستان شاعری میں خاک اڑنے لگے۔

کلکتہ کے شعراء کو بھی پچھلے دونوں اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، انہیں جب شعر سنا کے داد وصول کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا تو بغل میں بیاضیں داب کے شہر کے بڑے بڑے چوراہوں پر کھڑے ہو گئے اور راہ گیروں کو اپنا کلام سنا سنا کے داد وصول کرنا شروع کر دی۔ لیکن وہ تو کلکتہ والے تھے اور کلکتہ کے بعض شاعروں کا یہہ انداز مدت سے چلا آتا ہے کہ ایک ہاتھہ میں لٹھہ ہے، دوسرے میں دیوان یا کلام سنئے اور داد دیجئے ورنہ لٹھہ کھائیے، ہمیں ڈر ہے کہ کراچی کے میرزا منش شاعروں سے یہہ بھی نہیں ہو سکے گا اس لئے حکومت ہی کو کوئی انتظام کر دینا چاہئے، کیا یہہ ممکن نہیں کہ آٹے اور چینی کی طرح داد کا بھی راشن مقرر کیا جائے۔

ایک زمانے میں بعض شعراء پھیری لگا کے شعر بیچتے تھے، اور داد کے ساتھہ ساتھہ اشعار کی نقد قیمت بھی وصول کر لیتے تھے، جن دنوں میر تقی اور میرزا سودا کی شاعری عروج پر تھی، میر خان کمترین ایک بڈھے شاعر تھے جنہوں نے پرانے استادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں، یہہ صاحب جمعہ کے جمعہ دھلی کے ایک مشہور بازار یعنی سعد اللہ خاں کے چوک میں آ کھڑے ہوتے تھے، پٹھانوں کی وضع تھی، لمبا کرتہ، اس پر پٹکہ سر پر بڑا سا پگڑ، ہاتھہ میں بلم، گھر سے چلتے وقت بہت سے پرزوں پر غزلیں قطعے اور متفرق اشعار۔ لکھہ کے پٹکے میں اڑس لیتے تھے، یہہ سارا مال گھڑی دو گھڑی میں بک جاتا تھا، استاد مصحفی یوں بازار میں کھڑے ہو کے اپنا کلام تو نہیں بیچتے تھے لیکن ان کا کلام بھی بکتا تھا اور بہت سستا بکتا تھا، یعنی آٹھہ آنے سے ایک روپے غزل کی قیمت مقرر تھی۔

لاہور میں اغلب نام ایک شاعر تھے وہ رہنے والے تو یو۔پی کے تھے مگر زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا تھا وہ اپنے آپ کو اغلب کا مد مقابل اور حریف سمجھتے تھے، اس لئے غالب کی چوٹ پر اغلب تخلص کیا تھا کہ تفضیل کا صیغہ ہے۔ راقم نے اکثر دیکھا ہے کہ گرمیوں کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہے آگے آگے اغلب ہیں، پیچھے پیچھے ایک مزدور ان کے کلام کا پشتارہ اٹھائے آ رہا ہے، اغلب بھی اپنا کلام بیچتے تھے لیکن ان کا کلام کبھی فروخت نہیں ہوا کیونکہ بہت مہنگا تھا۔ قصیدہ کی قیمت ایک لاکھہ روپیہ، پانچ ہزار روپے سے کم میں غزل بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، انہوں نے لاہور کے بعض روساء کی شان میں قصیدے لکھے صلہ نہ ملا تو نالش داغ دی، اور حساب وہی لگایا یعنی ایک لاکھہ روپیہ فی قصیدہ۔

کوئی بارہ برس ہوئے اغلب صاحب سے آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تھی راقم نے کلام سنانے کو کہا۔ کہنے لگے "میاں گورنمنٹ نے میرا کلام چرانے کے لئے ایک نیا طریقہ نکالا ہے یعنی میں کلام سناتا ہوں اور ریڈیو والے آواز کی لہریں صاف اڑا لے جاتے ہیں کہ اصل میں ریڈیو کے محکمے کا نام ہی نام ہے میرا کلام چرانے کے لئے یہہ سوانگ رچایا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اغلب سے ملاقات نہیں ہوئی، غالباً ان ہی دنوں ان کا انتقال ہو گیا۔

کراچی کے جن شعرا کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں نہ تو معاوضہ ملنے کی حاجت نہ انعام کی پروا۔ داد مل جائے تو یہی بہت ہے۔

لیکن مشکل یہہ ہے کہ کراچی سے مشاعرہ ہی غائب ہوا جا رہا ہے، لیڈر کو "حاضرین" نہیں ملتے۔ شاعر کو سامعین ہاتھہ نہیں آتے، جو افسر قسم کے صاحب مقدرت لوگ ہیں انہیں تو مشاعرہ کرنے کی حاجت ہی نہیں، دفتر میں اپنے ماتحتوں کو جمع کر کے کلام سنانا شروع کر دیا اور داد وصول کر لی لیکن جو شاعر نہ آفس میں، نہ کرسی میں وہ بیچارے کہاں جائیں، معلوم نہیں ان دنوں لاہور کا کیا حال ہے یعنی وہاں بھی اس مال کی کھپت ہے یا نہیں۔

کہئے تو کراچی سے شاعروں کی ایک کھیپ بھجوا دی جائے۔

(نوائے وقت)

انجمن کی خبریں

اعظم گڈھ

اردو سب کمیٹی کی صدارت جناب سید صباح الدین صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ نے فرمائی۔ آپ نے خاص طور پر اپنے خطبہ میں اردو کی جامعیت اور غیر فرقہ وارانہ حیثیت پر زور دیا۔ آپ نے ٹھوس دلائل کے ساتھ یہہ باور کرایا کہ اردو زبان جو ہندو مسلم اتحاد کی ارتقائی یادگار ہے آسانی سے دم نہیں توڑ سکتی آپ نے پرزور الفاظ میں حکومت کی زبان کے معاملہ میں تنگ نظری پر اظہار افسوس کیا۔ صدر کے بعد شری شیو ناتھہ پروفیسر ڈی-اے وی کالج بنارس نے تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے یہہ ہندوستانی قوم کا مشترکہ قیمتی سرمایا ہے حامیان...اردو سے آپ نے اپیل کی کہ وہ موجودہ حالات سے متاثر نہ ہوں۔ اردو زندہ زبان ہے۔ اور زندہ رہے گی کیونکہ اس سے زیادہ کسی زبان میں قوت نمو نہیں ہے۔ طلباء میں ڈسپلن کے نقصان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ اس کا اصل سبب اردو فارسی زبان کی تعلیم سے محروم کرنا ہے جو اخلاقی تعلیم پر بہت زور دیتی ہیں۔ رام کمار صاحب چوبے پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی نے جو چودہ مضامین میں ایم-اے ہیں اردو کی حمایت میں بڑی جوشیلی تقریر فرمائی اور حکومت کی روش پر سخت نکتہ چینی کی۔ آپ نے اس سلسلہ میں چند اشعار پڑھے جو بہت مقبول ہوئے:-

هر صبح کو یہہ شام الم یاد رہے گی
یہہ وقت کے ماتھے کی شکن یاد رہے گی
یہہ دن تو کسی طرح سے کٹ جائیں گے لیکن
یہہ بے رخی اہل وطن یاد رہے گی

ٹونک

سید منظور الحسن برکاتی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک اطلاع دیتے ہیں کہ:- ٹونک کے قدیم اور تاریخی محلہ قافلہ میں انجمن ترقی اردو ٹونک کا ایک اور انعامی مشاعرہ منجانب نائب صدر انجمن جناب منشی عبدالبصیر صاحب بصیر، زیر صدارت جناب حافظ عبدالحی صاحب رعنا صدر انجمن و مہتمم توشہ خانہ ہزہائی نس ٹونک منعقد ہوا، مصرعہ مطروحہ

کہ ہر بجلی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

میں بڑی کامیاب غزلیں ہوئیں۔

طرحی دور کے بعد ان شعراء نے جن کے پاس طرحی غزلیں نہ تھیں اپنا غیر طرحی کلام سنایا، جن میں حضرت صولت، حضرت رعنا، حضرت ذائق، حضرت عیش، جناب فرید، مولانا صفدر، شادان، شوکت علی آرزو، رضا، گلزار اور ساغر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

صدر مشاعرہ نے مندرجہ ذیل شعرا کو انعامات تقسیم کئے:-

۱- جناب جوش مالوی - ۲- جناب فاخر اعجازی- ۳- جناب قتیل جے پوری- ۴- جناب صاحبزادہ صفدر- ۵- جناب عبدالرحیم صاحب حافظ- ۶- جناب مبارک علی صاحب دل- ۷- جناب گل-

جناب ناصح اور ظہیر الدین بابر کو اسپیشل انعامات دیئے گئے۔

انجمن ترقی اردو ٹونک کا یہہ تیسرا انعامی مشاعرہ تھا، اس سے پہلے دو مشاعروں میں اعلیٰ حضرت ہزہائی نس نواب صاحب ٹونک کی جانب سے گراں قدر انعامات شعراء کو دئے جا چکے ہیں۔

مشاعرہ کی سکریٹری شپ کے فرائض جناب مبارک علی صاحب دل نے بحسن و خوبی انجام دیئے۔ اب انجمن ترقی اردو ٹونک کا چوتھا انعامی مشاعرہ عنقریب منعقد ہونے والا ہے:

انجمن کی بعض نئی مطبوعات پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا تبصرہ

[آل انڈیا ریڈیو سے ۲۶ جون کو نشر کیا گیا]

ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں۔ زندگی کا ڈھانچا ایک ہے۔ اس میں سائنس آرٹ اور فلسفے کے خانے نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح بڑا ادب بھی وہ ہے جو زندگی کا خادم ہے۔ اور جو اس کی تہذیب میں، اس کے سنوارنے میں، اس کے بہتر بنانے میں، مدد دے۔ زندگی بھی آج وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ سائنس اور عقلی علوم کے پھیلنے کی وجہ سے اس میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ ہم لاکھ چاہیں کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ قایم کر لیں زمانہ ہمیں چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ اس کلینک میں سنیک ممکن نہیں ہے۔ دنیا سکڑ گئی ہے اور حد بندیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح ادب بھی آج خانوں میں تقسیم نہیں ہے۔ وہ ماضی اور حال اور حال اور مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ اور انسانیت کے ایک ہونے کا پیغام سناتا ہے۔ آج ادب کی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہمارے اندر فکر و نظر کی گہرائی ہو۔ ہم تاریخ کے اشاروں کو سمجھیں۔ تمام علوم وفنون کو ایک جانیں۔ ان کے بیچ میں دیواریں کھڑی نہ کریں۔ اور تخیل کے ساتھ سائنس اور عقلیات کا گہرا علم رکھیں۔

اردو میں عقلی علوم اور فلسفہ پر مختلف کتابیں موجود ہیں۔ اور اس سلسلے میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔ اور دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ جامعہ ملیہ دہلی۔ اور انجمن ترقی اردو علی گڈھ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اس سہ ماہی میں انجمن ترقی اردو علی گڈھ نے خاص طور پر اس کی کوشش کی ہے کہ ان موضوعات پر مفید کتابوں کا اضافہ کیا جائے۔

اطلاقی سماجیات

سب سے پہلے مجھے جعفر حسن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی کتاب اطلاقی سماجیات کا ذکر کرنا ہے۔ یہ اس خاص موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی اس کو اردو میں اس قسم کی پہلی کتاب سمجھنا چاہئے۔ سماجیات پر کسی نے اتنی آسان اور سلیس زبان میں نہیں لکھا۔ اسلئے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں شبہ نہیں۔

سماجیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نظری جسمیں سماج کی ساخت۔ سماجی زندگی کی بنیاد اور سماجی زندگی کے اصول اور قوانین بیان کئے جاتے ہیں۔ دوسری قسم اطلاقی ہے جسمیں سماج کی خوشحالی پر زور دیا ہے۔ سماج کی موجودہ خرابیوں پر غور کیا جاتا ہے۔ اور ان کو دور یا کم کرنے کے طریقوں پر سوچا جاتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہم اس علم کو کیوں سیکھیں۔ اور اگر سیکھیں بھی تو کیا بغیر کتاب کے نہیں سیکھہ سکتے۔ ہمارے ملک میں کتنے آدمی ہیں۔ جو معاشیات یا اکنامکس نہیں جانتے پھر بھی اس سے واقف ہیں۔ انہوں نے سیاسیات کی باقاعدہ کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ پھر بھی بہت اچھے سیاست دان ہیں۔ اسکا جواب یہہ ہے کہ اول تو اس قسم کی غیر معمولی سوجھہ بوجھہ کے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اور اتنی بڑی آبادی میں واقعی انکی تعداد نہ ہونیکے برابر ہے۔ دوسرے ماہر اور غیر ماہر واقف کار اور نوسیکھہ میں ہمیشہ فرق رہیگا زندگی کے ہر شعبہ میں نظم اور ترکیب کی ضرورت ہے۔ اسلئے سماج کاری اور رفاہ کاری کے کام بھی ایسے ہیں جو بغیر پہلے سے اچھی طرح سوچ وچار کے عمدہ طریقہ سے نہیں کئے جا سکتے۔

ہمارے ملک میں کتنے کام ہیں۔ جو سماجیات کے ذیل میں آتے ہیں۔ غریبی کا سوال ہے۔ نوجوانوں اور بچوں میں جرم پسندی کا مسئلہ ہے۔ چھوٹے ہوئے مجرموں کی دیکھہ بھال ہے فرقہ واری معاملے ہیں۔ بوڑھوں اور بے روزگاروں کی امداد ہے۔ لازمی بیمہ ہے اوقات کی نگرانی اور انکی آمدنی کا مصرف ہے۔ ہڑتالوں کو دور یا کم کرنا ہے۔

شراب بندی کی ہو جاتا ہے۔ عصمت فروشی کی روک تھام ہے۔ کھیل کود اور پارک کھولا کرنا ہے۔ غرض یہہ اور اسی طرح کے دوسرے کام سماجیات کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اور ہمیں اپنے ملک کو اونچا کرنے کے لئے ان سب کاموں کو ہوشیاری اور لیاقت کے ساتھہ کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں سماج کے پرزوں کو صاف کرنا ہے۔ اُن کی گرد اُنکا زنگ دور کرنا ہے۔ تا کہ وہ مشین کو آگے بڑھنے اور تیز چلنے میں مدد دیں۔ اطلاقی عمرانیات یا سماجیات کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ وہ ہمیں اصلاح اور سدھار کے کاموں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر جعفر حسین نے اس کتاب میں یہہ بتایا ہے۔ کہ سماجیات کا دوسرے علوم سے کیا تعلق ہے۔ دولت اور خوشحالی کا مفہوم کیا ہے۔ غریبی کیا ہے کیوں ہے اور وہ کس طرح دور ہوسکتی ہے۔ عیب اور جرم کی قسمیں کیا ہیں۔ اور اُن کے دور کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں سماج کاری اور رفاہ کاری کی اہمیت اور نوعیت کیا ہے۔

یہہ کتاب باوجود ٹکنیکل ہونے کے نہایت دلچسپ اور آسان ہے۔ اور انجمن ترقی اردو قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اس اہم موضوع کی طرف دھیان دیا۔

انواع فلسفہ اس سلسلہ کی دوسری کتاب جو ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ وہ انواع فلسفہ ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو [ہند] نے شائع کیا ہے۔ یہہ دراصل پروفیسر ہاکنگ کی Types of Philosophy کا ترجمہ ہے جسکو ظفر حسین صاحب نے انجام دیا ہے۔ بیس سال سے اسکی شہرت اور مقبولیت میں فرق نہیں آیا اس کی وجہ یہہ ہے کہ یہہ کتاب عام فہمی اور سلاست بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان نہیں نہایت مشکل کام ہے۔ اٹلی کے مشہور فلسفی کروچے Croce کا تو خیال ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ہر زبان کی کچھہ الگ خصوصیتیں ہیں الفاظ کا صوتی درو بست ہے۔ ان کی ہم آہنگی ہے۔ وہ جذبات ہیں جو ان سے وابستہ ہیں۔ ان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہے لیکن زبان کی اوپری جذباتی سطح کے نیچے ایک گہری سطح خیالات کی بھی ہوتی ہے۔ وہاں تک ترجمہ کرنے والے کا پہنچنا مشکل نہیں ہے۔ اوپر کی سطح پر ہنگامہ ہے۔ نیچے سکون ہے۔ اور ٹھراؤ ہے۔ اس لئے مترجم کو اسی خیال کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ ان خیالات کو صحت کے ساتھہ پیش کردے۔ اس کے لئے لفظی ترجمہ کے بجائے آزاد ترجمہ ہی مفید ہوسکتا ہے۔ ظفر حسین خاں صاحب نے اس کی کوشش کی ہے اور کسی جگہہ صحت اور سنجیدگی کو ہاتھہ سے نہیں جانے دیا۔

ہاکنگ نے تاریخ کے ذوق اور نظام خیال کے ذوق کو باہم ملادیا ہے۔ اور کائنات کے نظریوں کی ان چند انواع کو چن لیا ہے جو تاریخ فلسفہ میں بار بار آبھرتی ہیں۔ اس طرح انہوں نے مختلف نظریوں کے نمائندہ مفکرین سے روشناس کرایا ہے اور فلسفیانہ انتشار سے بچا لیا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو ان دونوں کتابوں کی اشاعت غلط معلوم ہو۔ لیکن جو لوگ دل کے ساتھہ ذہن کی بیداری کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ اعلیٰ ادب بغیر فکر و نظر کی گہرائی اور سائنٹفک شعور کے ممکن نہیں۔ وہ یقیناً انجمن کے اس کام کی داد دیں گے۔ یہہ کام اس لئے اور بھی قابل قدر ہے کہ ان کتابوں کا انداز بیان اور انداز فکر اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ ایک طالب علم بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ادبی اور قومی تذکرے بڑی حق ناشناسی اور ناسپاسی ہوگی اگر انجمن ہی کی ایک اور کتاب "ادبی اور قومی تذکرے" کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس کے مصنف پنڈت کشن

پرشاد کول ہیں۔ اس میں چودہ مضامین ہیں۔ سات ادبی اور سات قومی۔ پنڈت جی اُن بزرگواروں میں ہیں جنہوں نے ادبی اور تہذیبی مسائل پر پورے غور و فکر کے بعد قلم اُٹھایا ہے۔ اور جو رائے اُنہوں نے قایم کی ہے وہ جلد بازی میں نہیں۔ خوب سوچ سمجھکر قائم کی ہے۔ اس کے ہر پہلو کو دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ اُن کی نظر زندگی کے حقائق پر ہے۔ سماجیات کے نکتے اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اُنہوں نے ٹھوس زمین کو چھوڑ کر ہوا میں اپنا گھر نہیں بنایا۔ اُن کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں ہماری ملی جلی تہذیب کی بہار تھی۔ اور جہاں اتحاد و اتفاق کا آب حیات بہتا تھا اور جہاں راہ وفا کو ہمیشہ تلوار کی دھار سمجھا گیا یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے ماضی پر کشادہ قلبی سے حال پر ایمانداری سے اور مستقبل پر دوربینی سے غور کیا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے بے لاگ لکھا ہے۔ آپ اُن کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے خلوص اور اُن کی نیت پر شبہ نہیں کر سکتے۔ نئے ادب کے بعض لکھنے والوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ کس بل ہے، حوصلہ و ہمت ہے، جوش عمل ہے۔ لیکن فطرت اپنی سب ہی خوبیاں تو کسی ایک کو نہیں دیدیتی ان کے ادب میں ادبیت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ اور خرافات زیادہ" وہ پریم چند اور جوش کو ترقی پسند کہنے کے لئے آمادہ نہیں۔ پریم چند ستیہ جگ اور رام راج کے عاشق اور گاندھی وادی ہیں۔ کارل مارکس سے اُنہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی طرح جوش کے متعلق اُنکا خیال ہے کہ وہ باکمال شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں حسن کاری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن وہ انقلابی شاعر نہیں ہیں۔ پنڈت کشن پرشاد کول کا خیال ہے کہ اُن کی انقلابی شاعری "اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے" ہمارا خیال ہے کہ وہ پریم چند اور جوش کو اس دائرہ سے خارج کر کے ترقی پسندی کے مفہوم کو بہت محدود کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی حیثیت ایک روشنی کے مینار کی سی ہے۔ جنہوں نے آگے کے راستے کو روشن کر دیا ہے اور نئے اور نوجوان لکھنے والوں پر بے انتہا اثر ڈالا ہے۔ اُنہوں نے ہم کو نئی قدریں دی ہیں۔ زندگی کا احترام اور انسانیت کی قدر و قیمت بتلائی ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔

پنڈت کرشن پرشاد کول نے عریاں نگاری اور جذباتی اُبال پر جو اعتراضات کئے۔ وہ صحیح ہیں۔ عریاں نگاری صرف ایک وسیلہ ہے مقصد نہیں مریضوں کی سی عیش پسندی کبھی بھی پسندیدہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ اُنہوں نے کرشن چندر کے اس قول پر اعتراض کرتے ہوئے "اگر فحاشی ہے تو ہر ڈاکٹر فحش پسند ہے" لکھا ہے "مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی حیثت ڈاکٹر یا طبیب کی نہیں۔ بلکہ ادیب یا افسانہ نگار کی ہے۔ آپ طب کی کتابیں نہیں لکھتے بلکہ ترقی پسند ادب کی تخلیق کے دعویدار ہیں۔

اس مجموعہ میں اس کے علاوہ ہندی اُردو یا ہندوستانی دیر و حرم کے قصے۔ اکبر الہ آبادی اور اُن کی شاعری ہمارا پرانا اور نیا کلچر۔ لکھنؤ کا ایک لطیفہ۔ اینی لاہ اور اہلوتی کے خطوط پڑھنے کے قابل ہیں۔

پنڈت کرشن پرشاد کول نے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں مہاتما گاندھی۔ راجہ رام موہن رائے۔ سوامی دیانند سرسوتی۔ راناڈے۔ سرسید احمد خان، اور گنگا پرشاد ورما کے متعلق دلچسپ مضامین لکھے ہیں۔ جن میں اندھی اور بہری عقیدت کے بجائے توازن اور اعتدال ہے اور اسلوب کی دلکشی نے ان میں زندگی کی گرمی اور حرکت پیدا کر دی ہے۔

باہتمام عزیز حسین منیجر نیشنل پرنٹرس کمپنی میں چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشر نے صدر دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڈھ سے شائع کیا۔